باوجود ہتھیلی پر جان رکھ کر میدان قتال میں آ گئے ہو تو تم نے ثابت کر دیا کہ تم مومن صادق ہو۔ اور جو جان بوجھ کر پیچھے رہ گئے' کونوں کھدروں میں چھپ گئے تو معلوم ہو گیا کہ وہ مدعی ایمان ہُوا کریں لیکن ان کے دلوں میں ایمان حقیقتہً نہیں ہے۔ وہ منافق ہیں۔ یہ تمیز کیسے ہوتی ہے۔ اگر یہ شکل نہ ہوتی! یہ ابتلاء کا فلسفہ ہے یہ آزمائش کی حکمت ہے۔ اس بات کو یوں بھی سمجھ لیجئے کہ قرآن مجید کہتا ہے کہ یہ دُنیوی زندگی ہے ہی آزمائش کے لئے خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلاً ..... علامہ اقبال مرحوم نے اغلباً اسی آیت کی تعبیر اس شعر میں کی ہے ؎

قلزم ہستی سے تو ابھرا ہے مانندِ حباب
اس زیاں خانے میں تیرا امتحان ہے زندگی

ابتلاء کا وہی لفظ یہاں آیا لیبلوا بعضکم ببعض تاکہ اللہ تعالیٰ تم لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعہ سے آزمائے..... اس نے مشرکین و کفار کو چھوٹ دی وہ قریباً بارہ برس تک مکہ میں محمدٌ رسولُ اللّٰہ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗ کو ستاتے رہے اللہ تعالیٰ چاہتا تو ابوجہل کا ہاتھ شل کر دیتا اور وہ حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا کو شہید نہ کر سکتا۔ اللہ تعالیٰ چاہتا تو امیہ ابن خلف کو فالج زدہ کر دیتا اور وہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو کوئی گزند نہ پہنچا سکتا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے مشرکین کو اہل ایمان پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑنے کی چھوٹ دیئے رکھی۔ کیوں! اس لئے کہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ صنف نازک ہونے کے باوجود حضرت سمیہ کے دل میں کتنا ایمان ہے! لوگوں کے سامنے یہ بات کیسے آتی کہ حضرت بلالؓ کے دل میں اللہ کی توحید پر کتنا پختہ یقین ہے! اور انؓ کے دل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کتنی محبت ہے! انؓ کے دل میں یوم آخرت پر کتنا ایمان ہے!۔ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر پتھروں کی بارش کرنے کی آزادی اللہ نے اہل طائف کو دی تاکہ لوگوں کو علم ہو جائے کہ ہمارے رسول، صلی اللہ علیہ وسلم صبر و ثبات' استقامت' توکل علی اللہ میں کوہ ہمالیہ سے بھی بلند و بالا شخصیت ہیں۔ فداہ امی وابی۔ یہ ہے بعض کو بعض کے ذریعہ سے آزمانا۔ یہ ہے وہ نظام جس کے ذریعہ تربیت مقصود ہے۔ یہ جانچ پرکھ کا وہ نظام ہے جو ازل سے اللہ کی حکمت بالغہ نے تمہارے لئے طے کر رکھا ہے..... تمہیں تو ابھی آزمائش کی بھٹیوں سے گذار کر کندن بنانا ہے تمہیں تو اسلام کے عالمی غلبہ تک سفر کرنا ہے۔ اب وہ معاملہ نہیں ہو گا کہ آفات ارضی و

(باقی ص۶۳ پر)

مؤلف: ڈاکٹر محمد رفیع الدین
مترجم: ڈاکٹر ابصار احمد

منشورِ اسلام

(۷)

نماز زبانی تکرار نہیں، بلکہ ذہنی عمل کا نام ہے

ذکر ایک ذہنی عمل ہے نہ کہ صرف الفاظ کا تکرار اعادہ۔ ذکر کی اصل روح تفکر و تدبر کی وہ داخلی کیفیت ہے جو حسن ازلی کے ساتھ تعلق کی استواری سے پیدا ہوتی ہے۔ اور یہ کیفیت بلا استثناء تسبیح و تحمید، عجز و انکساری، خوف و رجا اور مسرت و اطمینان کے جذبات عالیہ کے ساتھ وقوع پذیر ہوتی ہے۔ اور یہ جذبات یکے بعد دیگرے محب کے ذہن میں محبوب حقیقی کے ساتھ اس کے وقتی رجحان اور تعلق کی مناسبت سے آتے جاتے ہیں۔ الفاظ کا زبان سے بار بار ادا کرنا صرف اس لیے ہے تاکہ یہ عاشق کی اس کیفیت کے حصول میں مدد دے اور یہ مدد اس طرح ہوتی ہے کہ یہ الفاظ حسن ازلی کی ان صفات پر ارتکاز توجہ کا باعث بنتے ہیں جن کا اظہار ان سے ہوتا ہے۔ اگر نماز یا عبادت کا بدنی عمل اس داخلی ذہنی سعی کے ساتھ نہ ہو تو وہ جذبات محبت و عبودیت میں بالیدگی کا باعث نہیں ہو سکتا۔ اگر نماز یا ذکر کا عمل مندرجہ بالا جذبات کے ساتھ ہے تو یہ اس امر کا قطعی ثبوت ہے کہ داخلی کوشش موجود ہے اور محب کا علم و عرفان ترقی پذیر ہے۔ قرآن مجید مندرجہ ذیل آیات میں اسی حقیقت کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔

وَيَدْعُونَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا ۖ وَكَانُوا لَنَا خَاشِعِينَ ۝ (الانبیاء: ۹۰)

ترجمہ: "اور وہ امید و بیم کے ساتھ ہمیں پکارتے تھے اور ہمارے آگے (عجز و نیاز سے) جھکے رہتے تھے"

قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ ۝ الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ ۝
(المومنون: ۱-۲)

ترجمہ: "یقیناً (وہ) ایمان لانے والے فلاح پاگئے جو اپنی نماز میں خشوع رکھنے والے ہیں۔"

اُدْعُوا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً ۚ (الاعراف: ۵۵)

ترجمہ: "اپنے رب کو پکارو، گڑگڑاتے ہوئے اور چپکے چپکے۔"

وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا ۚ اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ

(الاعراف: ۵۶)

ترجمہ: "اور اُسی کو پکارو (اُس کے عذاب سے) ڈرتے ہوئے اور (اس کی رحمت سے) اُمید رکھتے ہوئے۔ بے شک اللہ کی رحمت نیکوکاروں سے قریب ہے۔"

خدا سے واقعی محبّت رکھنے والا فرد ہمیشہ خوف اور رجا کے بین بین رہتا ہے اس کو خوف اس بات کا رہتا ہے کہ مبادا وہ جذبۂ محبّت سے تہی دامن ہو کر اپنے محبوب کی ناراضگی مول نہ لے لے۔ اور امید و رجا اس بات کی ہوتی ہے کہ اس کی محبّت و سپردگی اسے اپنے محبوب کی نظروں سے پہلے سے زیادہ بلند کرے گی۔ یہی وجہ ہے کہ پیغمبرِ اسلام حضرت محمّد صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

اَلْاِيْمَانُ بَيْنَ الْخَوْفِ وَالرَّجَاءِ۔

ترجمہ: ایمان خوف اور اُمید کے درمیان پایا جاتا ہے۔

عبادت گزار کا سب سے بڑا انعام اس کے جذبۂ محبّت اور نتیجتاً اس کی شخصیّت کا کامل ارتقائ ہے

جب محبّتِ خداوندی خلوص اور نکھار کا اعلیٰ ترین مرتبہ حاصل کر لیتی ہے تو اس وقت محبّ محبوب کی ناراضگی سے فی نفسہٖ خائف رہتا ہے۔ اس کا یہ خوف اس سزا یا عقوبت کے ڈر سے نہیں ہوتا جو اس طور واقع ہو سکتی ہے۔ اس کے نزدیک محبوب کی ناراضگی سے بڑی سزا ناقابلِ تصوّر ہے۔ اسی طرح وہ محبوب کی پسند اور رضا کا فی نفسہٖ طلبگار ہوتا ہے نہ اس لیے کہ یہ کسی دوسرے انعام کا باعث بنتا ہے۔ اس کے نزدیک محبوبِ حقیقی کی پسند اور رضا سے زیادہ بڑا کوئی

انعام نہیں ہے۔ ازروئے قرآن اللہ تعالیٰ کی رضا وہ سب سے بڑا انعام ہوگا جو کسی صاحبِ ایمان کو جنّت میں داخل ہوتے ہوئے حاصل ہوگا۔

وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (التوبہ: ۷۲)

ترجمہ: "اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اللہ کی خوشنودی انہیں حاصل ہوگی یہی بڑی کامیابی ہے۔"

یہ انعام اتنا خوش کن اور لذّت آگیں ہوگا کہ اس کی کیفیّت یا کمیت کا کوئی ہلکا سا اندازہ بھی اس دنیا میں نہیں لگایا جاسکتا۔

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ ۚ جَزَاۗءً بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۔ (السجدۃ: ۱۷)

ترجمہ: تو کسی متنفس کو علم نہیں کہ کیسا کیسا آنکھوں کی ٹھنڈک (کا سامان) ان کے لیے (خزانۂ غیب میں) مخفی ہے۔ یہ ہے صلہ ان کے (نیک) اعمال کا۔

اس متوقع انعام کی نوید جانفزا اُسے جنّت الفردوس کے دروازے پر ہی سنادی جائیگی۔

يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَىِٕنَّةُ ۝ ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ ۝ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ ۝ (الفجر: ۲۷-۳۰)

"اے نفسِ مطمئن چل اپنے رب کی طرف اس حال میں کہ تُو اُس سے راضی اور وہ تجھ سے راضی۔ شامل ہو جا میرے (نیک) بندوں میں اور داخل ہو جا میری جنّت میں۔"

عبادت کے زندہ عمل کے ساتھ عبدیّت، عجز و انکساری اور نفی ذات کے جذبات اس لیے ہوتے ہیں کہ انسانی خودی اپنے خالق اور معبود کے قریب سے قریب تر ہونا چاہتی ہے اور یہی صورتِ حال حسنِ لازوال پر تدبّر و تفکّر میں ہوتی ہے۔ یہ جذبات و احساسات محبّ کے شعورِ ذات اور اثباتِ خودی کے ساتھ متصادم نہیں ہوتے۔ بلکہ درحقیقت یہ انہیں مزید تقویت پہنچاتے ہیں کیونکہ ذاتِ حقیقی کے ساتھ قرب و اتّصال اس میں ایک بے مثال قوّت اور برتری کا احساس اجاگر کرتا ہے۔ محبوب کے حسن اور قدرت کے مقابلے میں وہ اپنے آپ کو جتنا ہیچ اور کم تر خیال کرتا ہے اور جیسے جیسے وہ محبوبِ حقیقی کی صفاتِ حسن و قدرت کا عرفان زیادہ سے زیادہ حاصل کرتا ہے، وہ خود اپنی عظمت سے آگہی حاصل کرتا چلا جاتا ہے۔

چنانچہ اس طور محبوب کی صفاتِ حسنہ سے وہ خود حصہ پاتا ہے اور اپنی شخصیت میں ان کا انجذاب کرتا ہے۔

باجماعت نماز پنجگانہ (صلوٰۃ)

صاحب ایمان لوگوں کا باقاعدہ نظم کے تحت اور اپنے میں سب سے افضل شخص کو امام بنا کر اس کی اقتدا میں پانچ وقت نماز ادا کرنا اقامتِ صلوٰۃ کہلاتا ہے۔ اور یہ ذکر کی سب سے اچھی شکل ہے۔ نماز میں ذکر کی وہ ممکنہ اور کم سے کم مقدار آجاتی ہے جس کی ایک صاحب ایمان کے ذوق محبت کے اظہار اور اس کی بالیدگی کے لیے ضرورت ہوتی ہے۔ اس سے نہ صرف ذکر کی عادت مستحکم بنیادوں پر قائم ہوتی ہے، بلکہ اس سے اس کے ذوق محبت کو بھی وقفوں کے ساتھ تقویت پہنچتی ہے جو اس کے مستقبل میں افزونی کا باعث بنتی ہے۔ نماز کا مقام صاحب ایمان لوگوں کی جمعیت میں انتہائی اہمیت کا ہے۔ یہ ان کی پوری عملی زندگی کے لیے محور کا کام کرتی ہے اور ذکر سے معمور زندگی کا عملی نقشہ پیش کرتی ہے۔ تاہم صرف فرض نماز ایک مومن کے ذوق محبت کی بالیدگی اور اس کی بلند ترین سطح حاصل کرنے کے لیے کافی نہیں ہے اور اس سے اس سطح پر مطلوب ذکر کی مقدار پوری نہیں ہوتی۔ اور ظاہر ہے کہ روحِ انسانی کا مطمع نظر ترقی کی یہی چوٹی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک سچے مومن کو فرض نمازوں کے علاوہ بھی اپنی روحانی ترقی اور ترفع کے لیے ذکر کے اہتمام کی تاکید کی گئی ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝

"پھر جب نماز ہو چکے تو (تم کو اختیار ہے کہ) زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو اور اللہ کو کثرت سے یاد کرتے رہو تاکہ تم فلاح پاؤ۔"

فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا ؕ (البقرۃ: ۲۰۰)

"پھر جب تم اپنے حج کے ارکان پورے کر چکو تو جس طرح تم اپنے باپ دادوں کے

ذکر میں لگ جاتے تھے اس طرح اب اللہ کا ذکر کرو بلکہ اس سے بھی بڑھ کر:

الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ۔

(آل عمران: ۱۹۰)

"جو اٹھتے، بیٹھتے اور لیٹتے، ہر حال میں خدا کو یاد کرتے ہیں۔"

حسنِ ازل کے ساتھ رشتۂ محبت ایک عجیب لذت، انبساط اور اطمینان کا باعث بنتا ہے اور جوں جوں ذوقِ محبت ذکر و فکر کے ساتھ بڑھتا ہے یہ انبساط و اطمینان بھی بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اور یہ نہ صرف یہ کہ کسی صاحبِ ایمان کے یقین میں اضافے کا باعث بنتا ہے، بلکہ اس کی حیثیت ایک گہرے ذاتی تجربے کی ہوتی ہے۔ یہ ذاتی تجربہ اس کو اپنے ہدف کا علم اور اس کی درستگی کا پتہ بھی دیتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ صاحبِ ایمان کے لیے امید اور اعتماد کی ایک بنیاد فراہم کرتا ہے۔ اور مقصدِ اعلیٰ کے حصول میں کوشش کو ابھارتا اور منضبط کرتا ہے بفحوائے آیتِ قرآنیہ:

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ ؕ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ۔ (الرعد: ۲۸)

"ایسے ہی لوگ ہیں جو ایمان لائے ہیں اور اُن کے دل اللہ کی یاد سے مطمئن ہوتے ہیں۔ یاد رکھو، اللہ کی یاد ہی سے دلوں کو اطمینان نصیب ہوا کرتا ہے۔"

ذکر سے جو غیر معمولی اور مخصوص اطمینان ایک شخص کو حاصل ہوتا ہے وہ بجائے خود اس امر کا ثبوت ہے کہ ذکر فطرتِ انسانی کی اہم ترین ضرورت اور داعیے کو پورا کرتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ فطرت کا نظام ہی کچھ ایسا ہے کہ ہر فطری خواہش خواہ اس کا تعلق حیاتیاتی سطح سے ہو یا نفسیاتی سطح سے، جب پوری ہوتی ہے تو اس کے نتیجے کے طور پر آسودگی اور خوشی حاصل ہوتی ہے۔ اور اسی خوشی اور آسودگی سے اس خواہش یا داعیے کی تکمیل کی جہت کا تعین ہوتا ہے۔

اخلاقی کردار۔ خارجی عمل میں حُسن کا اظہار

صحیح نصب العین جس خارجی عمل کو ابھارتا ہے، وہ صفاتِ حُسن کا اپنے تئیں اور دوسروں

کے ساتھ برتاؤ میں اظہار پر مشتمل ہوتا ہے۔ عام طور پر اسے اخلاقی عمل کا نام دیا جاتا ہے مگر نصب العین کی طرح صحیح مذہبی نصب العین کا بھی ایک اپنا اخلاقی قانون ہوتا ہے جو فرد کے ہر عمل کی نوعیت اور قدر و قیمت کا تعین کرتا ہے۔ چونکہ یہ قانون صفاتِ حسن سے اپنا جواز فراہم کرتے ہیں، چنانچہ جو فرد بھی ان قوانین کی پابندی کرتا ہے اس کا عمل بھی صفاتِ عالیہ کا مظہر ہوتا ہے۔ یہ امر مسلّم ہے کہ جو شخص کسی نصب العین کو اپناتا ہے اور اس سے محبت کرتا ہے وہ اپنی محبّت کا اظہار ہر ممکن عمل میں کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو کوئی صحیح دینی نصب العین سے محبّت کرتا ہے وہ اس کا اظہار نہ صرف حسنِ لازوال پر ارتکازِ توجہ سے کرتا ہے بلکہ اپنا پورا عمل بھی اسی کے مطابق کر لیتا ہے۔ اس کے شب و روز اور اس کا پورا کردار و عمل اس کے عین مطابق ہو جاتے ہیں:

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ لَاشَرِیْکَ لَہٗ ۚ وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ ۝ (الانعام: ۱۶۳، ۱۶۴)

"کہو، میری نماز، میری قربانی، میرا جینا اور میرا مرنا، سب کچھ اللہ ربّ العٰلمین کے لیے ہے جس کا کوئی شریک نہیں۔ اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور سب سے پہلے سرِ اطاعت جھکانے والا میں ہوں۔"

محبّتِ حسن اور اخلاقی عمل کو علیحدہ نہیں کیا جا سکتا

اگر ایک مدعیٔ ایمان اپنے عمل میں اللہ تعالیٰ کی صفاتِ حسنہ کا اظہار نہیں کرتا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے اپنے خالقِ حقیقی کی صفات اور حسن کا کوئی ادراک حاصل نہیں کیا اور نہ ہی اُسے اس سے محبّت ہے۔ کیونکہ یہ ناقابلِ تصوّر ہے کہ ایک شخص اللہ کی صفاتِ حسنہ مثلاً حسن، انصاف، حق، خیر، محبّت وغیرہ سے متاثّر ہو لیکن اپنے عمل میں ان کا اظہار قطعاً نہ کرے یعنی وہ انصاف کی بجائے ظلم، محبّت کی بجائے نفرت و تشدّد اور حق کی بجائے باطل کا اظہار کرے۔ اگر وہ اپنے دعویٰ محبّت میں سچا اور مخلص ہے تو تمام اندرونی اور بیرونی مشکلات

اور موانع کے علی الرغم اللہ تعالیٰ کی صفاتِ حسنہ کے سانچے میں اپنے عمل کو ڈھالنے کی حتی المقدور کوشش کرتا ہے۔ اور اس سعی و جہد میں وہ صفاتِ حسنہ کے شعور کو زیادہ سے زیادہ حاصل کرتا، اپنے ذوقِ محبّت کو بڑھاتا اور خود آگہی کی بلند تر منزل حاصل کرتا چلا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ ذوقِ محبّت کا جب تک عمل سے تعلق رہتا ہے اُس کی شدّت میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اور جونہی وہ عمل سے جدا ہو کر شعوری سطح سے نیچے گرتا ہے، اس کی شدّت میں کمزوری واقع ہو جاتی ہے۔

جو شخص ایک بار نیک اور راست عمل کرتا ہے، اس کا دوبارہ کرنا اُس کے لیے نسبتاً آسان ہو جاتا ہے۔ ایک ایسا شخص جس میں ظلم و تعدی عادتاً موجود ہو جب ایک بار شعوری طور پر مشفق و کریم ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ تو یہی عمل بار بار کرنے پر اس کے لیے آسان سے آسان تر ہو جاتا ہے۔ اِس کی وجہ اُس کے ذوقِ محبّت کی صحیح رُخ میں نشوونما ہے۔ ایک غلط عمل کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ ایک بار صراطِ مستقیم سے انحراف کر کے جب ایک شخص غلط کام کا ارتکاب کرتا ہے تو اُس کے لیے صراطِ مستقیم پر مراجعت مشکل تر ہو جاتی ہے، کیونکہ اس کے ذوقِ محبّت میں کمی اور اضمحلال واقع ہو جاتا ہے۔ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ ہماری خود آگہی اور ذوقِ محبّت کا ارتقار کاملۃً ہمارے اعمال کی اخلاقی نوعیّت پر منحصر ہے۔ ایک ایسا فرد جو حسنِ ازل کی پہچان کے بعد اس سے تعلّق کا اظہار صرف ذکر و فکر کی شکل میں کرتا ہے لیکن اپنے روزمرہ کے افعال و اعمال میں اس کا اظہار نہیں کرتا۔ خود آگہی اور عرفانِ ذات کے اعلیٰ مدارج حاصل نہیں کر سکتا۔ بلکہ احتمال اس بات کا بھی ہے کہ اس کا ذوقِ محبّت کم ہو جائے کیونکہ صرف گیان دھیان سے وہ اسے جتنا مستحکم کرتا ہے، اپنی بے عملی کے نتیجے میں وہ اُسے اس سے زیادہ کمزور کر دیتا ہے اور یہ طرزِ عمل یقینی طور پر گھاٹے کا سودا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص صبح کے وقت دو گھنٹے اپنے ہدف کی طرف صحیح راستے پر چلے۔ لیکن دن کا باقی حصّہ بالکل مخالف سمت میں چلتا رہے۔ ظاہر ہے کہ ایسا شخص کبھی بھی اپنی منزلِ مقصود پر نہیں پہنچ سکتا بلکہ اس سے دُور ہی ہٹتا چلا جائے گا۔

اخلاقی عمل کیونکر رفتہ رفتہ آسان تر ہو جاتا ہے

جب کوئی محبّ صحیح نصب العین سے محبّت کرنا شروع کرتا ہے تو آغاز میں اُس کا جذبۂ محبّت کمزور ہوتا ہے چنانچہ اس نصب العین کے اخلاقی قانون کی پیروی میں بھی کوتاہی اور نقص رہ جاتا ہے۔ مکمل اور ہر نقص سے پاک پیروی ارتقاءِ خودی کی بلند سطح پر ہی ممکن ہے۔ جب تک محبّ یا سالک اُس منزل تک نہیں پہنچ جاتا۔ انتہائی کوشش کے باوجود وہ اکثر غلطیوں اور خامیوں کا مرتکب ہوتا رہتا ہے۔ لیکن جب نماز اور دوسرے اذکار کا باقاعدہ اہتمام کر کے وہ حسنِ لازوال سے اپنا رشتۂ محبّت مضبوط کر لیتا ہے اور اپنے نفس کے اندھے داعیات پر کنٹرول حاصل کر لیتا ہے تو اس کے لیے جملہ اخلاقی قوانین پر کاربند ہونا آسان تر ہو جاتا ہے۔ اس کا عمل خامیوں سے مبرّا اور اخلاقی اعتبار سے اعلیٰ تر ہوتا چلا جاتا ہے اور حسنِ مطلق کی صفاتِ حمیدہ سے اُس کی ہم آہنگی بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اس سطح پر اخلاقی عمل حسن پر ارتکازِ توجہ مزید ممکن بنا کر فرد کو اعلیٰ تر سطح کی خود شعوری اور ادراکِ ذات بہم پہنچاتا ہے۔ حسنِ مطلق کی زیادہ بہتر معرفت اور معیّت پا کر جب ایک صاحبِ ایمان اپنے مشغولاتِ ذکر و فکر کی طرف لوٹتا ہے تو وہ محسوس کرتا ہے کہ وہ اب ان میں پہلے سے کہیں زیادہ ارتکازِ توجہ کر سکتا ہے اور اس طرح وہ ان سے اطمینان و انبساط بھی زیادہ حاصل کرتا ہے۔ حسنِ مطلق کا یہ مراقبہ اس کے جذبۂ عشق کو مہمیز دیتا ہے اور زندگی کے شب و روز میں اخلاقی قانون کی بجا آوری کو سہل بنا دیتا ہے۔ اس طرح مراقبہ (یعنی ذکر و فکر) اور اخلاقی عمل باہم دگر لازم و ملزوم ہیں اور دونوں مل کر فرد کو ادراکِ ذات کے اعلیٰ تر مقام پر لے جاتے ہیں، حتیٰ کہ وہ ارتقاءِ جذبۂ حُبّ کی اعلیٰ ترین منزل تک رسائی حاصل کر لیتا ہے۔ چنانچہ امر واقعہ یہ ہے کہ جذبۂ محبّت کی اگر مناسب آبیاری کی جائے اور اس کے تقاضوں کو مسلسل کما حقہٗ پورا کیا جائے تو اس میں ضرور اضافہ ہوتا ہے اور اس کی شدّت و قوت دو چند ہو جاتی ہے۔ بفحوائے آیاتِ قرآنیہ: وَيَزِيدُ اللّٰهُ الَّذِينَ اهْتَدَوْا هُدًى ط

(مریم : ۷۶)

ترجمہ: جو لوگ راہ راست پر ہیں اللہ ان کو (روز بروز) زیادہ ہدایت دیتا چلا جاتا ہے۔

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ط

(العنکبوت : ٦٩)

ترجمہ: اور جو لوگ ہماری راہ میں مشقتیں برداشت کرتے ہیں ہم ضرور انہیں اپنے راستے دکھائیں گے۔

اِنَّهُمْ فِتْيَةٌ اٰمَنُوْا بِرَبِّهِمْ وَزِدْنٰهُمْ هُدًى ٥

(الکہف : ١٣)

ترجمہ: وہ چند نوجوان تھے جو اپنے رب پر ایمان لے آئے تھے اور ہم نے ان کو ہدایت میں ترقی بخشی تھی۔

گناہ کی حقیقت

(ا) اسباب گناہ: ایک مسلمان سے لغزش یا غلطی کا صدور صرف اس وقت ہوتا ہے جب وقتی طور پر اس کا ذوقِ حسن صحیح نصبُ العین سے مخالف سمت میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔ اور یہ اسی وقت ہوتا ہے جب کوئی خیالِ فاسد اسے اپنی جانب متوجہ کر کے جذبۂ محبّت کی غلط سمت میں راہنمائی کرتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ عمل صحیح نصب العین کی بجائے کسی باطل نصب العین کی مقصد براری کرتا ہے۔ چنانچہ ایک غلطی یا سیاہ کاری دوسری غلطیوں کے لیے راہ ہموار کر دیتی ہے۔ کوئی باطل یا فاسد خیال ایک ضعیف الاعتقاد شخص کے دل میں یہ یقین پیدا کر دیتا ہے کہ اگر وہ اس کام کو انجام دے لے تو اسے مسرّت حاصل ہو گی یا کسی عارضی رنج و الم سے چھٹکارا ہو جائے گا۔ حالانکہ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ اس عمل کے تقاضے اس کے حسن مطلق کے ساتھ رشتۂ محبّت کے تقاضوں اور مطالبوں کے خلاف اور متضاد ہیں چنانچہ اصل مسئلہ اس کی اپنی خودی اور اس کے استحکام کا ہے۔ اگر اس میں پختگی نہیں ہے تو وہ حقیقی محبوب اور اس کی محبّت کو پسِ پشت ڈال کر اس عارضی آرام یا مسرّت کو ترجیح دے دیتا ہے۔ بالفاظ دیگر وہ اس لمحے کے لیے حقیقی ایمان اور محبّتِ الٰہی سے تہی دامن ہو جاتا ہے اور اس سے غلط اعمال کا صدور ہوتا ہے۔

(ب) گناہ کا خودی پر اثر : جب باطل خیال اور اس کے زیر اثر باطل عمل وقوع پذیر ہو جاتا ہے اور اس کی عارضی لذت ختم ہو جاتی ہے تو ایک صحیح الاعتقاد مسلمان اس لغزش و نسیان کے بعد دوبارہ اپنے محبوب حقیقی کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ لیکن وہ محسوس کرتا ہے کہ اس کی یہ محبت کمزور پڑ گئی ہے اور شیطانی افعال و خیالات کے ساتھ اس کا رشتہ مضبوط ہو رہا ہے۔ فطرت کا اٹل قانون ہے کہ جیسے خیالات ذہن انسانی میں گھر کیے رہیں گے اور جس قسم کے افعال کا ظہور اس کے اعضاء و جوارح سے ہوگا، ان کا ایک گہرا تاثر اس کے قلب و ذہن پر پڑے گا۔ یہ حقیقت نیک افعال کے بارے میں بھی اتنی درست ہے جتنی افعال شنیعہ کے بارے میں۔ چنانچہ امر واقعہ یہ ہے کہ کوئی فعل خواہ وہ کتنا ہی حقیر ہو، انسانی خودی کے لیے انتہائی اہمیت کا حامل ہے اور اس کی تعمیر یا تخریب کا کام کرتا ہے۔

گناہ سے بچنے کا طریقہ

ایک غلط خیال پہلے پہل انسان کی قوت متخیلہ پر اثر انداز ہوتا ہے اور بعد ازاں اس کے قوائے عمل پر گرفت حاصل کرتا ہے۔ جونہی یہ ذہن میں داخل ہوتا ہے اسی لمحے وہ اس محبت پر نقب زنی کرتا ہے جو صحیح نصب العین کے لیے مختص ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ یہ خیال اتنا قوی ہو جاتا ہے کہ وہ انسان سے عمل بد کروانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ہونا یہ چاہیے کہ خیال فاسد کو ذہن میں آنے کے بعد فوراً ہی دبا دیا جائے۔ کیونکہ دیر تک غلط سوچ کا ذہن پر مستولی ہونے کا نتیجہ عمل بد کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ غلط سوچ اور فکر ہی ہمیشہ غلط کام کا پیش خیمہ ہوتا ہے جس کو شیطانی وسوسے کے تحت کچھ وقت کے لیے ذہن میں گل کھیلنے کا موقع دے دیا جاتا ہے۔ اگر فکر بد کو تخیل کی سطح پر فوری طور پر ختم نہ کیا جائے یہ لازماً عمل بد پر منتج ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک مومن صادق کے خیال میں جونہی کوئی شیطانی وسوسہ آتا ہے وہ فوراً متوجہ ہو کر شعوری طور پر اسے اپنے ذہن و قلب سے نکال باہر کرتا ہے کیونکہ وہ ایک پل بھر کے لیے بھی اللہ تعالیٰ کی ناراضگی مول نہیں لینا چاہتا۔ ان مومنین صادقین کی یہ شان قرآن کریم نے اس طرح بیان کی ہے :

اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّھُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّیْطٰنِ تَذَکَّرُوْا فَاِذَا ھُمْ مُّبْصِرُوْنَ ۝ (الاعراف: ۲۰۱)

ترجمہ: حقیقت میں جو لوگ متقی ہیں، اُن کا حال تو یہ ہوتا ہے کہ کبھی شیطان کے ڑسے کوئی بُرا خیال اگر انہیں چھو بھی جاتا ہے تو وہ فوراً چوکنے ہو جاتے ہیں۔ اور پھر انہیں صاف نظر آنے لگتا ہے (کہ ان کے لیے صحیح طریق کار کیا ہے)

غلط خواہش نفس سے بچنے کا نقد فائدہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کی اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبّت بڑھ جاتی ہے اور وہ اس دنیا میں بھی خوف وحزن سے محفوظ رہتا ہے اور آخرت میں جنّتِ نعیم کا حقدار بنتا ہے۔ جب تک انسان کے ذہن وقلب کے کسی گوشے میں باطل نظریے کے ساتھ تعلق کا کوئی شائبہ پایا جاتا ہے، خواہ اس نے ابھی عمل اس باطل نظریے کے مطابق نہ کیا ہو، وہ حقیقی معنوں میں مومن صادق اور محبِ صادق نہیں ہے۔ جیسا کہ ایک حدیث نبویؐ میں آیا ہے، اس میں ایمان رائی کے دانے کے برابر بھی نہیں رہتا۔

گناہ انسان کی فطرتِ سلیم کے خلاف عمل ہے جو انسانی خودی کے ارتقاء اور ترفّع کے عمل میں منفی کردار ادا کرتا ہے۔ یہ انسان کے باطن کی قلبِ ماہیت کر کے اس کی ترقّی کی راہ میں رکاوٹ کھڑی کر دیتا ہے۔ اس کو ہٹائے بغیر کوئی مسلمان روحانی ترفّع حاصل نہیں کر سکتا۔

گناہ کے بُرے عواقب سے بچنے کا طریقہ تطہیرِ نفس

گناہ کے بُرے عواقب اور اثرات سے بچنے کا طریقہ یہ ہے کہ انسان معصیت کے ارتکاب کے فوراً بعد خود احتسابی کرے اور یہ دیکھے کہ وہ کون سی ذہنی کیفیت اور حالت تھی جس کی وجہ سے معصیت کا ارتکاب ہوا۔ اسے اس بات کی از حد پشیمانی ہونی چاہیے کہ وہ جن نفسانی خواہشات کا غلام بن گیا تھا وہ انتہائی گھناؤنی اور قابلِ مذمّت تھیں۔ جتنی گہری یہ پشیمانی ہوگی اتنا ہی اس بات کا امکان کم ہوگا کہ وہ دوبارہ اس گناہ کو دہرائے۔ اس مقصد کے لیے یہ بھی ازبس ضروری ہے کہ وہ حسنِ ازلی پر دوبارہ بھرپور طریقے پر ارتکاز توجہ کرے تاکہ اس تعلق قلبی میں جو کمی واقع ہو گئی تھی وہ پوری ہو جائے۔ جونہی وہ معصیت اور اس کے غلط اثرات کو

اپنے ذہن وقلب سے دھونیتا ہے۔ پھر انابت الی اللہ کے مراحل طے کرنے لگتا ہے۔ یہ تطہیری عمل جس کے ذریعے ایک عاصی انسان اپنے نفس کو پاک کرتا ہے "توبہ" یا رجوع الی اللہ کہلاتا ہے بطور ذہنی عمل رجوع یا توبہ کے چار اجزا ہیں:

۱۔ غلطی اور معصیت کا اعتراف یعنی یہ احساس کہ جو کچھ اس نے چاہا یا کیا وہ انتہائی قبیح تھا۔ اس کے ساتھ ہی اسے تہہ دل سے اپنے کیے پر ندامت اور پشیمانی ہونا ضروری ہے۔

وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا
عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا ط (التوبۃ: ۱۰۲)

ترجمہ: "اور کچھ دوسرے لوگ ہیں جنہوں نے اپنے قصوروں کا اعتراف کر لیا ہے۔ ان کا عمل مخلوط ہے، کچھ نیک ہے اور کچھ بد۔"

۲۔ خیال اور عمل دونوں کی سطح پر اس معصیت کو انجام نہ دینے کا عزم مصمّم:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا ط (التحریم: ۸)

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ کے حضور میں توبہ کرو، خالص توبہ۔"

۳۔ معرفتِ الٰہی اور حُبِّ الٰہی کو دوبارہ حاصل کرنے کی بھرپور کوشش اور اس کے لیے اخلاقی اصلاح کی حتی المقدور سعی۔

فَمَنْ اٰمَنَ وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ
وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (الانعام: ۴۸)

"پھر جو کوئی ایمان لایا اور اس نے (اپنے طرزِ عمل کی) اصلاح کر لی تو ایسے لوگوں کے لیے کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں ہے۔"

۴۔ خالق حقیقی کی صفاتِ حسنہ پر تجدید ایمان اور اس حقیقت کا یقین کہ اس کا مربّی اور اس کی خودی کو بالیدگی اور نشوونما دینے والا سوائے اللہ تعالیٰ کے کوئی اور نہیں ہے۔ چنانچہ وہ اسی تعلے سے عفو و درگزر کا خواستگار ہوتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اسی کی خوشنودی اور رضا کے ساتھ حقیقی روحانی ترفّع حاصل کر سکتا ہے۔

وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ

يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝ (النساء : ۱۱۰)

ترجمہ: اور جو شخص کوئی بُرا کام کرے یا اپنی جان پر ظلم کرے پھر اللہ سے مغفرت طلب کرے تو وہ اللہ کو بڑا مغفرت والا (اور) بڑا رحم کرنے والا پائے گا۔

توبہ کے محولا بالا ذہنی لوازم اُس وقت بطریق احسن پورے ہوتے ہیں جب ایک بندۂ عاصی تہہ دل سے قرآن میں سکھائی گئی یہ دعائیں پڑھتا ہے اور ان کے ایک ایک لفظ کا گہرا شعور حاصل کرتا ہے:

رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝ (الاعراف : ۲۳)

"اے رب ہمارے! ہم نے اپنی جانوں پر بڑا ظلم کیا اور اگر تُو نے ہم سے درگزر نہ فرمایا اور رحم نہ کیا تو یقیناً ہم خسارہ پانے والوں میں ہو جائیں گے۔"

لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّىْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ (الانبیاء: ۸۷)

"(خدایا!) تیرے سوا کوئی معبود نہیں، پاک ہے تیری ذات بے شک میں ہی قصوروار ہوں۔"

نفس اور روح کی مکمل تطہیر اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک انسان اُن تمام خواہشات، تمناؤں اور افعال سے اجتناب نہیں کرتا جو اس کی فطرت سلیمہ کے خلاف ہیں اور ہر طرف سے منہ موڑ کر اس حسن ازلی کی طرف رُخ نہیں کر لیتا جس کی عبادت و محبت کی خواہش اس کے وجود کی گہرائیوں سے پھوٹ رہی ہے۔

وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا ۝ (المزمل: ۸)

ترجمہ: اور سب سے کٹ کر اُسی کے ہو رہو۔

معصیت پر تہہ دل سے ندامت و پشیمانی اور خدا کے حضور گریہ و آہ و زاری کے ذریعے ایک سیاہ کار اپنے رب کے بے پایاں فضل سے اس قابل ہوتا ہے کہ وہ حق تعالیٰ کے ساتھ اپنا ٹوٹا ہوا ایمانی رشتہ دوبارہ استوار کر سکے۔ اور اسی طرح اس کی خودی دوبارہ مستحکم ہو کر شیطانی وسوسوں کا مقابلہ کر سکتی ہے۔ مناجات اور آنسوؤں کے ساتھ خدا کے حضور دعائیں مانگنے کے لیے رات کا آخری حصہ بالخصوص مفید ہے۔ کیونکہ اس وقت دن کی مشغولیات سے توجہ نہیں بٹتی اور انسان